جدیداُردوتنقید۔چند بنیادی مباحث

ڈاکٹرفرمان فتح پوری*

Abstract:
In this paper, three trends in modern criticism of Urdu have been identified. The first trend appears to have emerged from a pessimistic view of life. It looks at life as a meaningless activity and therefore any social or cultural process or development is regarded useless. It has given expression to a sense of futility and aimlessness in life. The second trend is shaped up by a realization that due importance must be given to technical developments without undermining sociological and cultural development in human civilization. The third trend emerges from an effort to create a balance between individual freedom and society at large. Although all three trends contribute to the tradition of literary criticism, the healthiest trend is the third one that will save our society from a possible defeat in an onslought of Westernization.

کہا جاتا ہے کہ تخلیقی ادب، زندگی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔اس لیے زندگی کے بارے میں تخلیق کار کی نگاہ جتنی وسیع، عمیق اور متنوع ہوگی اُسی نسبت سے اس کی تخلیق میں بھی وسعت، عمق اور تنوع کے آثار نمایاں ہوں گے۔ کچھ اسی طرح کا رشتہ تخلیق اور تنقید میں ہے۔تنقید جنم لیتی ہے تخلیق کی دائیں یا بائیں پسلی سے اور عموماً انہیں صفات کی حامل ہوتی ہے جن سے تخلیق متصّف ہوتی ہے اور جس طرح ادب کو صفاتی لاحقوں کے ذریعے متعدد خانوں میں تقسیم کر کے قدیم ادب، قومی ادب، ملّی ادب، جدید ادب، کلاسیکی ادب، رومانی ادب، انقلابی ادب، ترقی پسند ادب، مارکسی ادب وغیرہ سے موسوم کر دیا جاتا ہے بالکل اسی طرح تنقید کو بھی صفاتی لاحقوں کے ذریعے تجزیاتی تنقید، قدیم تنقید، تاثراتی تنقید، سائنٹفک تنقید، عمرانی تنقید اور جدید تنقید وغیرہ کے خانوں میں بانٹ دیا جاتا ہے ورنہ اصلاً صرف تنقید کا لفظ، بحث کا مرکزی نقطہ قرار پاتا ہے۔

اس اعتبار سے جدید تنقید کی ترکیب میں ''تنقید کا لفظ'' جدید کے لفظ سے اہم تر ہے جدید کا لفظ تو تنقید کا وصفی یا اضافی کلمہ ہے۔جسے ہر عہد کا آدمی، اپنے تشخص اور اپنے دور کو گزشتہ دور سے الگ کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا

* صدر نشین، اُردو لغت بورڈ، کراچی۔

ہے۔ چنانچہ غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ یہی تنقید جسے آج جدید تنقید کہا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں ہر زمانے کے تہذیبی اقدار اور جمالیاتی رویوں کی تخلیق وفروغ میں شامل رہی ہے۔ ہمارے ادب میں بھی اس تنقید کا کردار بہت نمایاں ہے اور اس نے ادب کے ہیئت ومواد اور موضوع ومزاج سب پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ اگر ہم صرف اپنے عہد کی جدید تنقید اور اس کے نتائج واثرات پر نظر ڈالیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں اس کی نمو وظہور کے تین رُخ ہیں۔

ایک رخ تو وہ ہے جو زمینی رشتوں اور ہر قسم کے سیاسی وسماجی آدرشوں سے مایوس ہو کر ابہام واشکال اور بے معنویت ولایعنیت کا استعارہ بن گیا ہے۔ اس انداز تنقید کے پرستاروں کے نزدیک تہذیب وتمدن اور سیاست و سماج کے سارے نظریے اور رویے، زندگی کے حق میں بے اثر ہو چکے ہیں۔ الفاظ اپنا مفہوم کھو چکے ہیں اور اگر ان کے کوئی معنی ہیں تو صرف وہ، جو مادّی وسائل کے اجارہ داروں نے انہیں دیئے ہیں۔ فرد کے ذاتی تجربوں، خوابوں اور آرزوؤں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک آج کا انسان، مجمع میں اس طرح گم ہو گیا ہے کہ اس کا عدم وجود برابر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک زندگی سرے سے بے معنی اور مہمل ہے۔ خیالات کی ترسیل وابلاغ کی بھی اُن کے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے وہ خود کلامی ہی کو حاصلِ کلام جانتے ہیں۔

جدید تنقید کا دوسرا اہم رخ وہ ہے جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے زائیدہ تہذیبی مسائل اور ان سے پیدا شدہ اثرات کو پوری طرح محسوس تو کیا گیا ہے لیکن زندگی کو کسی قسم کی بے معنویت یا مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ رخ حقیقت میں ترقی پسند تحریک کے اثرات کا توسیعی رخ ہے۔ اس میں فرد کے مقابلے میں ہنوز سوسائٹی کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن فرد، سوسائٹی کا آلہ کار نہیں ہے۔ زندگی کو سنوارنے اور خوشگوار بنانے کے باب میں اس کا زاویہ نظر اجتماعی سہی لیکن انفرادی سطح پر وہ اس کا پابند نہیں، وہ اپنی سوچ، اپنے طرزِ احساس اور اس کے اظہار میں آزاد ہے اور اس آزادی کو وہ ادب کی جمالیاتی اقدار کے لیے ضروری جانتا ہے۔

جدید تنقید کے ادبی تجربوں کا ایک اور رخ ہے اور یہ رخ پہلے دونوں کے مقابلے میں زیادہ صحت مند اور حقیقت پسندانہ ہے۔ ہر چند کہ اس رخ کے شیدائی، فرد اور سوسائٹی دونوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، ان کے اقتصادی مسائل اور زمینی رشتوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان رشتوں کے معتبر ومقدس ہونے پر بھی یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی یقین ہے کہ زمین کے ہنگاموں کو سہل بنانے کے لیے آسمانی رشتوں کی ازسرنو دریافت ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک مسائل حیات کے باب میں، زمین کو آسمان سے یا آسمان

کو زمین سے الگ کر کے دیکھنا دکھانا بے معنی سی بات ہے۔ زمین و آسمان میں ازلی و ابدی رشتہ ہے اور اس گم شدہ رشتہ کی بازیابی ہی آدمی کے لیے وجہِ بشارت بن سکتی ہے۔ یہی رشتہ سچا اور اٹوٹ ہے اسی سے ذہن انسانی کو تشکیک و بے یقینی کی تاریک وادیوں سے نجات مل سکتی ہے اور یہی نوعِ انسانی کے بقا اور تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔

جدید تنقید کے حوالے سے یہ ہیں تین ذہنی رویے جو کم و بیش گذشتہ چالیس برسوں سے ہمارے ادب پر حاوی ہیں اور ناول، افسانہ نظم و غزل سب کی تنقید پر ان کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان رویوں کو میں نے کسی جگہ تہذیبی سایوں کا نام دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہماری تہذیب اس وقت شکست و ریخت کی زد میں ہے اس پر متعدد نظریات و مسائل کے سائے منڈلا رہے ہیں اور یہ سب باہم اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دکھانا بہت مشکل ہے اور اگر ان سب کو ایک ساتھ دیکھیں تو کوئی ایسی تصویر بنتی نظر نہیں آتی جسے لفظوں کے ذریعے پوری طرح دکھایا جا سکے یا سمجھایا جا سکے۔

ایسے میں جدید تنقید کے ان تینوں زاویوں یا سایوں پر نظر رکھنی ہوگی جن کے تحت اُردو کا تخلیقی ادب جنم لے رہا ہے، پرورش پا رہا ہے، مقبول ہو رہا ہے اور اکیسویں صدی میں اپنے قدم جما رہا ہے۔ اس کا قدم جمانا ابھی کسی خاص رخ یا سمت کی نشان دہی نہیں کرتا لیکن آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ یہ بے سمتی تا دیر قائم نہ رہے گی۔ اگر معاشی و معاشرتی اضطراب میں ٹھہراؤ آ گیا تو جدید تنقید کی بے قراری کو بھی قرار آ جائے گا۔

جدید اردو تنقید۔ چند بنیادی مباحث

(شعبۂ اُردو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے سیمینار کی رپورٹ)

ڈاکٹر قاضی عابد
استاد شعبۂ اُردو
بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

اس بات کو پسِ نو آبادیاتی تناظر میں سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا کہ پاکستان میں اردو زبان کے ساتھ ایک تحقیر بھرا رویہ کیوں فروغ پا گیا ہے۔ اردو جس کے بارے میں ایک زمانے میں جذباتی انداز میں یہ نعرہ لگایا جاتا تھا کہ اسلام، پاکستان اور اردو لازم و ملزوم چیزیں ہیں آج ہمارے معاشرے میں انگریزی زبان کے مقابلے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی۔ نیم خواندہ اور پڑھے لکھے دونوں ہی طبقوں میں اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا ہے کہ اردو زبان ان کے نزدیک مستقبل کے امکانات کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور اسے بطور ذریعہ تعلیم کے نچلے درجوں یا پھر اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے کسی بھی طرح کا کردار نہیں سونپا جا سکتا۔ ایسے عالم میں جب ملک کے ایک پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے اعلان کے لیے اور معاشرے کے لوگوں تک اس کے ثمرات پہنچانے اور جدید اردو تنقید کی بنیادی مباحث پر غور و فکر کے لیے دو روزہ سیمینار کا انعقاد واقعتاً ایک ایسی کاوش ہے جسے ہر حال میں سراہا جانا چاہیے۔

شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ 8 اور 9 ستمبر کو یہ دو روزہ سیمینار

کامیابی کے ساتھ منعقد کیا۔ اس سیمینار میں ملک بھر سے اردو کے ممتاز محققین، ناقدین اور اساتذہ کراچی سے پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی، لاہور سے پروفیسر ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر، بہاولپور سے پروفیسر ڈاکٹر عقیلہ شاہین اور ملتان سے ڈاکٹر محمد اسلم انصاری، مرزا ابن حنیف، ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر لطیف الزماں اور ڈاکٹر مختار ظفر شریک ہوئے۔

سیمینار کے پہلے دن اس سال شعبہ اردو سے فارغ التحصیل ہونے والے دس طلبہ و طالبات نے اپنے ایم فل کے تحقیقی مقالوں کا مجلسی دفاع پیش کیا۔ کاشف بلوچ نے ''پاک ڈریڈا – معاصر اردو تنقید اور ردِساختیات''، سارہ عنبر ''شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز کے افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ''، ارم اجمل ملک ''اردو ناٹک ''مرقع مہرانگیز و قباذ'' مطبوعہ ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۲ء کی تدوین''، ترنم بتول ''اردو شعری روایت میں عبداللطیف تپش کا مقام''، فرزانہ پروین ''نوطرزِ مرصّع (ترتیب و تصحیح متن) از محمد غوث زرّیں''، طارق محمود ''مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ادبی خدمات اور توضیحی اشاریہ'' (جھنڈیر لائبریری، سردار پور، میلسی میں موجود فائل کے حوالے سے)، روبینہ الماس ''اردو افسانے میں جلاوطنی کے تجربے کا اظہار''، فرحت افزا ''حسن بخش گردیزی کے سفرناموں کی تدوین''، شاہد نواز ''سعید احمد رفیق - احوال و آثار'' اور زرغونہ کنول نے ''اردو شعر و ادب کے فروغ میں مجلّہ ''سویرا'' اور محمد سلیم الرحمٰن کی خدمات'' کے موضوعات پر تحقیقی مقالات تحریر کیے ہیں۔ حاضرین نے مقالہ نگاروں سے ان کے موضوعِ تحقیق، طریق کار اور نتائجِ تحقیق کے حوالے سے سوالات کیے جن کا مقالہ نگاروں نے باطریق احسن جواب دیا۔

سیمینار کے موقع پر شعبہ کی طرف سے معزز مہمانوں کی خدمت میں شعبہ کی تاریخ پیش کی گئی۔ یہ تاریخ شعبہ کی طرف سے دوسری مرتبہ شائع کی گئی ہے۔ اس سے پہلے یہ 2000ء میں شائع کی گئی تھی۔ اب اس کا نیا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ پچھلے دو برس سے شعبہ اردو نے ایک انقلابی قدم یہ اٹھایا ہے کہ اپنے شعبے میں ہونے والی پی ایچ ڈی اور ایم فل کی سطح پر ہونے والی تحقیق کو شائع کر کے سامنے لایا جائے۔ اس سے محض تحسین حاصل کرنا مراد نہیں بلکہ اپنی تحقیق کو فخر کے ساتھ تنقید و احتساب کے لیے پیش کرنا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں:

۱۔	اُردو افسانہ اور عورت	ڈاکٹر عصمت جمیل
۲۔	علامہ طالوت	ڈاکٹر مختار ظفر
۳۔	اُردو افسانہ اور اساطیر	ڈاکٹر قاضی عابد

۴۔ پئے خوب تر نگارے — ڈاکٹر ممتاز کلیانی
۵۔ خطبات اقبالیات — ڈاکٹر انوار احمد / ڈاکٹر روبینہ ترین
۶۔ ملتان میں جدید اُردو نظم کی روایت — شازیہ عنبرین رانا
۷۔ حوالہ (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سیّد عامر سہیل
۸۔ ابراہیم جلیس ۔شخصیت اورفن — ڈاکٹر امتیاز بلوچ
۹۔ نادر ذخیرۂ غالبیات — فرح ذبیح

سیمینار کے دوسرے دن جدید اردو تنقید کے بنیادی مباحث کے حوالے سے معزز مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ایک ایسے دور میں جہاں لوگوں کی دلچسپیوں کا دائرہ اس قدر تبدیل ہو چکا ہے کہ ایک اچھی کہانی سننے کے لیے چار چھ سامعین مشکل سے میسر آتے ہیں۔چار آٹھ غزلیں سننے کے لیے چار آٹھ سامعین بھی تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ایسے میں شعبہ اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ ایک ایسے دن جب شہر میں مقامی تعطیل تھی اور یونیورسٹی آنے جانے کے وسائل بھی کچھ زیادہ نہ تھے،اس سیمینار کے لیے 150 سے زیادہ ادب اور تنقید سے دلچسپی رکھنے والے سامعین کو اکٹھا کیا جن کی اکثریت کا تعلق تو ملتان شہر سے تھا لیکن بہاولپور، لیہ، بھکر، ڈیرہ غازی خان، خانیوال، عارف والہ، ساہیوال اور میانوالی سے تشریف لانے والے شرکاء بھی تعداد میں کم نہ تھے۔

جدید اردو تنقیدی مباحث پر ہونے والے اس سیمینار میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر اسلم انصاری اور ڈاکٹر قاضی عابد شامل ہیں۔یہ اصحاب کسی قسم کے تعارف کے محتاج نہیں ہیں لیکن ضروری ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ قارئین تک پہنچایا جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری جو اس وقت 80 برس کے ہیں غیر معمولی طور پر نوجوانوں جیسی متحرک زندگی گزار رہے ہیں۔وہ پہلے پاکستانی ہیں جنہیں بیک وقت اردو ادب میں پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کرنے کا اعزاز ملا ہے۔وہ ایک طویل عرصے تک کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بطور استاد اور صدر شعبہ منسلک رہے ہیں۔ وہ سندھ پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور اردو لغت بورڈ کے سربراہ ہیں۔انہوں نے پچاس سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی کتب تالیف کی ہیں جن میں ہندی اردو تنازعہ، میر انیس حیات وخدمات، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، قدیم اردو مثنویاں، رباعی کا فن، اردو نعت گوئی، غالب شاعر امروز وفردا، اور میر کو سمجھنے کے لیے، بے حد اہم

ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی دورِ حاضر کے بے حد پڑھے لکھے اور قابل ذکر دانشور ہیں جو جدید مغربی اندازِ اقدار، مشرقی طرزِ تنقید دونوں پر یکساں دسترس کے حامل ہیں۔ انہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرتِ اظہار حاصل ہے۔ پچھلے چالیس برسوں سے ڈان میں ایریل کے نام سے ادبی وثقافتی کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کی اہم تنقیدی کتب میں توازن، نشانات، اشاریے، سرسید اور جدت پسندی بے حد اہم ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الدین عقیل اردو کے اساتذہ میں وہ دوسرے فرد ہیں جنہیں اردو ادب میں بیک وقت پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ پچھلے پچیس برسوں سے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہیں۔ وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف وتالیف کے سربراہ بھی ہیں۔ وہ ٹوکیو (جاپان) یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھاتے رہے ہیں۔ ان کی پینتیس سے زیادہ تصنیفات وتالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی چند اہم کتب یہ ہیں: اُردو کی اولین خودنوشت، پاکستان میں اُردو غزل، مسلمانوں کی جدوجہد آزادی__ مسائل، افکار اور تحریکات، نوادراتِ ادب، منتخباتِ اخبار اُردو، دکن کا عہد اسلامی، پاکستان میں اُردو غزل۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں اردو زبان کی تدریس کے سلسلے میں پچھلے چونتیس برس سے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ اب وہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین اور شعبہ اردو کے سربراہ ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر مغربی ادب کے شناور اور ایسے محقق ہیں جو مقدار پر معیار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی اہم کتب میں سے طرفیں، سمتیں، سرچشمے، داستانوں کی علامتی کائنات اور ایک ہی موسم کے پرندے، شامل ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر اردو تحقیق وتنقید میں اپنی بنیادی پہچان نفسیاتی دبستانِ نقد کے حوالے سے رکھتے ہیں لیکن انہوں نے نفسیات اور دیگر تہذیبی علوم پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کی تصنیف شدہ کتب میں نگاہ اور نقطے، نفسیاتی تنقید، مغرب میں نفسیاتی تنقید، ادب اور کلچر، غالب شعور اور لاشعور کا شاعر، بنیاد پرستی، تنقیدی دبستانِ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ اور جوش کا نفسیاتی مطالعہ اہم ہیں۔ وہ اردو کے پہلے ناقد ہیں جن کی تنقیدی کلیات بھی شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری تقسیم کے بعد ابھرنے والے غزل گو شاعروں میں امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اعلیٰ اظہار کیا ہے۔ وہ ایک اقبال شناس کے طور پر بھی شہرت رکھتے ہیں۔

اس سیمینار میں میزبانی کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر روبینہ ترین نے ادا کیے۔ ڈاکٹر انوار احمد اردو افسانے کی تحقیق وتنقید کے حوالے سے پورے برصغیر میں شہرت کے حامل ہیں۔ ان کی تصنیفات وتالیفات میں

اردو افسانہ تحقیق وتنقید، خواجہ فرید کے تین رنگ، یک جا، منٹو کی بیس کہانیاں، پریم چند کے بیس افسانے، پہلے سے سنی ہوئی کہانی اور ایک ہی کہانی اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر روبینہ ترین کی دلچسپی کے میدان میں تصوف، ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی اور تاریخ ادب شامل ہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی کتب میں ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، اظہارِ خیال، خواجہ غلام فرید شخصیت اور شاعری اور اصلاحاتِ تصوفات شامل ہیں۔

سیمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر غلام مصطفیٰ چوہدری تھے۔ وہ تہذیبی اور سیاسی علوم کے ایک روشن خیال محقق اور استاد کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اس طرح کی تقاریب کا انعقاد ان کی خصوصی دلچسپی کا رہین منت ہے جبکہ اس سیمینار میں صدارت جناب پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے کی۔ سیمینار کے پہلے مقرر ڈاکٹر سلیم اختر تھے ان کے مقالے کا موضوع ''مشرقی اور مغربی تنقیدی رویوں کا انجذاب'' تھا۔ انہوں نے کہا کہ مشرق اور مغرب اپنے تنقیدی مزاج میں کبھی ایک نہیں ہو سکے۔ مشرقی معیارات نقد نے مغرب سے استفادے کی جو بھی کوشش کی وہ سعیٔ نامشکور کے ذیل میں آتی ہے۔ حالؔی سے لے کر جدید ترین ناقدین ادب تک کوئی بھی مغرب کے انداز نقد کو اردو میں صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر سکا۔ اس کی بنیادی وجہ ان ناقدین کی کاوشوں کا غیر معیاری ہونا نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ مشرق اور مغرب کے تنقیدی شعور اور طرزِ احساس کا یکساں نہ ہونا ہے۔ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ مشرقی ادب کو مغربی تنقید کے پیمانوں کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے جدید ناقدین کی لغت، مغربی اصطلاحات اور مضامین مغربی ناقدین کی آراء کے بوجھ تلے کراہ رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک بے فیض عمل ہے جو تنقیدی سرگرمی کو باثروت نہیں بناتا۔ میں خود بھی اس ''جرم'' میں شامل رہا ہوں کیونکہ ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی تنقیدی مضمون کسی مغربی نقاد کی رائے کے بغیر معتبر یا مکمل نہیں ہوسکتا۔

سیمینار کے دوسرے مقالہ نگار ڈاکٹر سید معین الدین عقیل تھے۔ انہوں نے اختصار کے ساتھ اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں مختلف ادوار میں تنقید اور تحقیق کے درمیان کوئی ایک بامعنی رشتہ موجود رہا ہے۔ لیکن تاریخ ادب لکھنے کے رواج نے یقینی طور پر تنقید کے لیے تحقیق کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ رام بابو سکسینہ سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری تک اردو ادب کے تاریخ نگاروں نے تحقیق کے سرچشموں سے فیض اٹھایا۔ یہاں تک کہ احتشام حسین، انور سدید، تبسم کاشمیری وغیرہ نے جو بنیادی طور پر ناقدین ادب تھے، بھی تحقیق کے ساتھ بامعنی رشتہ استوار کر کے اپنی تواریخ کو استناد عطا کیا۔ تحقیق جہاں تنقید کے لیے ماخذات کے چراغ روشن کرتی ہے

وہیں تنقید تحقیق کو جانچ پرکھ کی کسوٹی اور اہم اور غیر اہم کے درمیان تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ اس لیے دورِ جدید میں تحقیق اور تنقید کا رشتہ ناگزیر رشتے کے طور پر ابھرا ہے۔

سیمینار کے اگلے مقرر شعبہ اردو کے مقرر ڈاکٹر قاضی عابد تھے۔ انہوں نے جدید مغربی تنقید اور جدید اردو تنقید چند ماخذات کے عنوان سے اپنے مقالے کی تلخیص پیش کی۔ جس میں انہوں نے ان اسباب و محرکات پر گفتگو کی جن کی وجہ سے جدید مغربی تنقیدی رجحانات جدید اردو تنقید کا روشن تناظر نہیں بن سکے۔ ان کا خیال تھا کہ لسانیات اور فلسفے کے علم کی صحیح ترتیب کا فقدان مشرق و مغرب میں جدید تنقید کے درمیان بے معنی رشتے کی عدم استواری کا بنیادی سبب ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے جدید لسانی فلسفوں کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جدید فلسفہ بنیادی طور پر لسانی فلسفہ ہے۔ انہوں نے سوزن۔ کے۔ لنگر کی کتاب ''فلسفے کا نیا آہنگ'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جدید زمانے میں فلسفہ لسان ہی فلسفے کا بنیادی آہنگ قرار پایا ہے۔ انہوں نے جدید تنقیدی بوطیقا کے لیے قدیم مشرقی زوایۂ نقد اور جدید مغربی تنقید کے امتزاج پر زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس ضمن میں سید عابد علی عابد سے لے کر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مساعی قابلِ تحسین ہے۔

سیمینار کے اگلے مقرر ڈاکٹر سہیل احمد خاں تھے جن کا موضوع ''تنقید کا نیا بحران'' تھا۔ انہوں نے کہا کہ جدید دور میں تنقید کیفیت کے اعتبار سے نہیں تو کمیت کے اعتبار سے اپنا سرمایہ روز بروز بڑھا رہی ہے۔ انہوں نے اپنی رائے کو وقیع بنانے کے لیے اپنے ویلک کی ''تاریخ انتقاد'' کا حوالہ دیا کہ اس قابل ذکر مصنف کو تنقید کی ابتداء سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک چار جلدیں ہی لکھنی پڑیں جبکہ بیسویں صدی کے پہلے پانچ عشروں کی تاریخ نقد لکھنے کے لیے بھی اسے چار جلدیں لکھنی پڑیں گویا جتنا کچھ تنقید کے میدان میں انیسویں صدی تک لکھا گیا اتنا ہی بیسویں صدی کے صرف پانچ عشروں میں وجود میں آ گیا۔ جدید دور میں تنقیدی سرمایے کا اتنی زیادہ مقدار میں وجود میں آنے کے بنیادی اسباب دو ہیں۔ ایک تو بیسویں صدی میں اشاعت کے ایسے ادارے وجود میں آئے کہ جن کی وجہ سے تنقیدی نگارشات بہت زیادہ سامنے آنی شروع ہوگئیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کا ذکر کیا اور ''ٹائمز لٹریری سپلمنٹ''، نیویارکر، لندن بکس ریویو اور دیگر جرائد کا حوالہ دیا۔ دوسرا سبب مغرب اور مشرق دونوں میں جدید تعلیمی اداروں کا فروغ اور ان میں کھلنے والے ادب کے شعبے ہیں۔ جہاں تحقیق اور تنقید دونوں میدانوں میں وسیع اور وقیع یا کم وقیع سرمایہ سامنے آنے لگا۔ انہوں نے کہا کہ تنقید کا موجودہ بحران انہی دو شعبوں میں پیدا ہوا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ اردو کے ادبی رسائل و جرائد کسمپرسی کا شکار ہیں

اور ادبی اخبار محض سکینڈل چھاپنے کے خوگر ہو گئے ہیں، جبکہ انگریزی اخبارات میں آج بھی ڈان میں اردو ادب کے بارے میں انتظار حسین کا کالم ہر ہفتے شائع ہوتا ہے۔ ماضی قریب میں صفدر میر کا کالم بھی چالیس برس تک تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے تنقید کے جدید بحران کو پیدا کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف جامعات میں ہونے والی تحقیق وتنقید روز بروز ساقط المعیاد ہوتی جارہی ہے۔ ان اداروں میں ہونے والی تحقیق وہاں کے صدورِ شعبہ کے مزاج کی عکاس ہوتی ہے۔ میرے علم میں ہے کہ ایک صدر شعبہ سے ایک انٹرویو میں جب فراق گورکھپوری کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ فراق سات یا آٹھ اشعار کا شاعر ہے۔ فراق کے بارے میں اس طرح کی رائے تعصب کے بغیر قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح ایک اور صدر شعبہ نے فیض احمد فیض پر مضمون لکھتے ہوئے ان کی سات آٹھ نگارشات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کے علاوہ فیض کا باقی کلام زندہ نہیں رہ پائے گا۔ اس طرح کی تشریحی تنقید اپنا اعتبار قائم نہیں کرسکتی۔ ایسے صدور ہائے شعبہ کے ہوتے ہوئے جس طرح کی تحقیق وتنقید وہاں ہوگی وہ بحرانی کیفیت کے علاوہ اور کیا پیدا کرسکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں علامتی شاعری کو پسند کرتا ہوں یا اپنے مزاج کے قریب سمجھتا ہوں۔ خطابیہ شاعری مجھے متاثر نہیں کرتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں یہ دعویٰ کروں کہ جوش ملیح آبادی شاعر نہیں تھے۔

سیمینار کے اگلے مقالہ نگار ڈاکٹر محمد علی صدیقی تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ جدید نوآبادیاتی حربوں نے انسانی ذہن اور محسوسات کو بھی تجارتی منڈیوں کی طرح استعمار کے تصرف میں لے آنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس ضمن میں جدید اندازِ نقد کو ایک ذریعے کے طور پر اس انداز میں استعمال کیا ہے کہ اب وہ مقبوضہ ذہن انھی کی پیدا کردہ سوچ کو انھی کی عطا کردہ زبان کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے مغرب اپنی پرانی مقبوضہ سرزمینوں کو بظاہر آزاد کرتے ہوئے اپنے ہی تسلط میں رکھنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دریدا دورِ جدید کا ایک ایسا مفکر ہے جس کی نیت پر تو شک نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ ڈس کورس کی ردِ تشکیل اس لیے ہونی چاہیے کہ یہ طاقت کا پیدا کردہ ایک مظہر ہے لیکن اس کے لیے وہ جن ذرائع کو استعمال کرتا ہے وہ ایک مرتبہ پھر مغربی استعمار کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور اس کی ردِ تشکیل ایک ایسا منظر پیش کرتی ہے جس میں انتشار کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اُنھوں نے کہا کہ بائبل کی ردِ تشکیل ہو چکی ہے اور کچھ دُور نہیں کہ ہماری مذہبی کتاب رروایات کو بھی ردِ تشکیل کے عمل سے گزارا جائے۔ ایسا ہونا مشرقی تہذیبی روایت کے لیے نقصان دہ ہے۔ کیونکہ اس عمل سے جس چیز کا خطرہ ہے وہ ہماری تہذیبی اقدار ہیں۔ ردِ تشکیل کے اس عمل کی زد میں یہ سب کچھ آسکتا ہے۔ ان

کا خیال تھا کہ ہمیں اپنی فکر کو پرفینن اور ایڈورڈ سعید کی مساعی سے جوڑنا چاہیے۔

تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفی چوہدری، وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان تھے۔ اُنھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادب اپنی بنت میں مزاحمت کا استعارہ ہوتا ہے۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اس یونیورسٹی میں کچھ ایسی قوتوں کے خلاف مزاحمت کی ہے جو بنیاد پرستی کی روایت کو قائم کر رہی تھیں اور روشن خیالی اور خرد افروزی کے خلاف تھیں۔ ادب اور تنقید دونوں اپنے مزاج کے اعتبار سے روشن خیال اور خرد افروز ہوتے ہیں۔ یہ بنیاد پرستی، تنگ نظری اور ملائیت کے خلاف ہیں۔ ہمارے جدید نقادوں کو چاہیے کہ اپنی تنقید کو زندگی کی تنقید کا استعارہ بنادیں اور معاشرے کی بہتری کے لیے اپنی خاص وضع میں کوشاں رہیں۔

تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے شگفتہ انداز میں شعبہ اُردو اور یونیورسٹی کو ایک اہم موضوع پر سیمینار کرانے اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے مجلسی دفاع کی روایت کا آغاز کرنے پر مبارک باد دی۔ اُنھوں نے موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج کے سیمینار کا جو عنوان ہے اس میں میرا خیال ہے جدید کے لفظ پر تنقید کے لفظ کو اہمیت دی جانی چاہیے اس لیے کہ تنقید کسی بھی لمحے قدیم نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر لحظہ جدید ہی رہتی ہے۔ تنقید جمالیاتی اقدار اور تہذیبی رویوں کو فروغ دینے کا عمل ہے۔ جدید تنقید کا اثر ہمارے ادب پر تین طرح سے پڑا ہے۔ ایک رخ تو وہ ہے جو زمینی رشتوں سے اور تہذیبی رویوں سے مایوس ہو کر لایعنیت اور ابہام کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زمینی رشتے اور تہذیب و سیاست ادب کو سمجھنے کا صحیح تناظر فراہم نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تناظر مادی وسائل پر قابض اجارہ داروں کے عطا کردہ ہے۔ جدید تنقیدی رویوں کا دوسرا رُخ وہ ہے جس میں جدید سائنسی اور تہذیبی تناظر کو اہمیت دی گئی لیکن زندگی کو لایعنیت، مایوسی یا ابہام کا شکار نہیں سمجھا گیا۔ یہ رخ فی الحقیقت ترقی پسند اثرات کا حامل ہے۔ یہ رویہ فرد اور معاشرے کے متوازن رشتے پر زور دیتا ہے اور فرد کو معاشرے سے باہر کی کوئی شے نہیں سمجھتا۔ تنقید کا تیسرا رُخ جو میرے نزدیک سب سے زیادہ صحت منداور روشن ہے وہ فرد اور معاشرے کے تعلق کو اہمیت دیتا ہے۔ ذہنی اور تہذیبی رشتوں کو ناگزیر سمجھتے ہوئے بھی آسمان سے ان کے تعلق کو لازمی قرار دیتا ہے۔ یہ تنقیدی رویہ زمین کو آسمان سے اور آسمان کو زمین سے الگ کر کے دیکھنے کا قائل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک زمین اور آسمان کا رشتہ مقدس ترین رشتہ ہے اور اس رشتے کی دریافت وہ تہذیبی بشارت ہے جو اس تنقید کا ماحاصل ہے۔ ان تینوں تنقیدی رویوں کے دھارے ہماری تنقید کی روایت کی شکل پذیری میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے اس وقت ہماری تہذیب ایک عجیب قسم کی شکست و ریخت کا شکار ہے۔ اس

وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تیسرے تنقیدی دھارے میں شریک ہو کر اپنے معاشرے کو تہذیبی شکست و ریخت سے بچائیں۔ میرے نزدیک یہ جدید تنقید کا اہم ترین کارنامہ ہوگا۔ سیمینار کے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین نے سیمینار کے مقررین، وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان اور سیمینار کے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے شعبے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم نے دو تین ایسے کام اپنے شعبے میں کیے جو ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ ہم نے ہر دو تین سال کے بعد اپنے نصاب کو جدید ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ قدیم ادب کی تدریس کے ساتھ ساتھ جدید ادب کی تدریس پر بھی زور دیا۔ اس لیے ہمارا طالب علم جہاں میر، ذوق، غالب اور اقبال کی ادبی خدمات سے واقف ہوتا ہے وہاں وہ فیض، راشد، ظفر اقبال، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی سے بھی نا آشنا نہیں رہتا۔ ہم نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے اپنے طالب علموں کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے ایک ایسا پرچہ متعارف کرایا ہے جس میں طالب علموں کو مکالمہ لکھنا، سکرپٹ لکھنا اور اشتہار تیار کرنا سکھایا جاتا ہے۔ ہمارا طالب علم قدیم تنقیدی روایت میں جہاں ارسطو اور لانجائنس کے تنقیدی نظریات سے شناسائی حاصل کرتا ہے وہاں وہ جدید ترین تنقیدی مباحث، ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت سے بھی پوری طرح آشنا ہوتا ہے۔ ہم نے خود تنقیدی یا خود احتسابی کی روایت کو قائم کرتے ہوئے اپنے تحقیقی سرمایے کو الماریوں سے نکال کر شائع کرنا شروع کیا ہے تاکہ لوگ ہماری تحقیقی کاوشوں سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر تنقیدی نظر بھی ڈال سکیں۔ ہم نے دوسری مرتبہ اپنے شعبے کی روایات اور تاریخ کو شائع کیا ہے۔ ہم نے جناب پروفیسر خلیل صدیقی صاحب کی طرف سے دی جانے والی کتب پر مشتمل ایک ریسرچ لائبریری قائم کی ہے۔ جسے ہم نے خلیل صدیقی صاحب کی محبت میں ان کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس لائبریری کا سرمایۂ کتب پروفیسر ڈاکٹر فاروق عثمان، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر افتخار حسین شاہ اور ہمارے معزز مہمانان جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے علاوہ جناب مشفق خواجہ کی مہربانیوں سے روز بروز بڑھ رہا ہے۔ سیمینار کے اختتام پر پہلے دن کی طرح شرکاء کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ یوں یہ شاندار سیمینار اختتام کو پہنچا۔